ذرائع ابلاغ کاآغاز وارتقاء اور عصری اہمیت

(ایک تحقیقی مطالعہ)

ڈاکٹر محمد ریاض*
dr.riazrazee@gmail.com

کلیدی کلمات: ذرائع ابلاغ، عصری اہمیت، آغاز وارتقاء، انسانی محنت، اکیسویں صدی، ابلاغی مناہج

خلاصہ

ذرائع ابلاغ کی دریافت انسانی محنت کا تسلسل اور ضرورت کے تحت معرضِ وجود میں آنے والا شاندار کارنامہ ہے۔ان کی پیدائش کا تعلق اگرچہ انسان کی شروعاتی زندگی سے ہے تاہم جدیدیت کا نیا روپ اکیسویں صدی میں سامنے آیا۔جس طرح دیگر شعبہ ہائے زندگی مثلاً رہن سہن، طرزِ زندگی، بول چال، سیاست، معیشت اور مختلف کاروبارِ زندگی میں جدت آئی ہے، بعینہٖ آج ذرائع ابلاغ کے مناہج میں بھی جدیدیت کا عنصر نمایاں نظرآرہا ہے۔قدیم ابلاغ کی وضعی اور عملی ہیئت کا دائرہ کار محدود تھا۔خاندان، قبیلہ، قوم، گاؤں کے افراد ابلاغ کے ابتدائی سامعین، شاہدین اور ناظرین شمار ہوتے تھے۔

جبکہ ابلاغی مناہج میں اشارے کنایئے، علامتی تصاویر(مجسمے)، بول چال، اجتماعات، میلے اور تحریر وتقریر جیسے عناصر شامل تھے۔بیسوی صدی کے اوائل تک اس شعبے کو صحافت کے نام سے جانا جاتا تھا۔البتہ دعوت، تبلیغ،ابلاغ،امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تقاریر، خطبات جیسے نام بھی انفرادیت کے طورپر بھی استعمال کئے جاتے رہے۔مندرجہ بالا صدی کے اختتام تک برقیاتی آلات نے اس کی جدت میں خاصا اضافہ کردیا، نہ صرف اس کی ہیئت بدل گئی بلکہ مختلف ناموں کے بجائے ایک ہی نام یعنی ذرائع ابلاغ سے اس کی شناخت عام ہوئی۔زیر نظر مقالہ میں ذرائع ابلاغ کو لغوی واصطلاحی تناظر میں بیان کرتے ہوئے آغاز وارتقاء اور اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔

اِبلاغ... لغوی مفہوم

ابلاغ کامادہ" بَلَغَ۔ب ل غ" ہےاور لفظ"بلغ"(بَلَغَ یَبْلُغُ اَلْبَلَغُ) فعل ثلاثی مجرد(1) سے ہے جو کہ نَصَرَیَنْصُرُ کے وزن پر آتا ہے۔اِبلاغ الف بمع کسرہ باب افعال(2) کا مصدر ہےاورثلاثی مزید فیہ(3) سے ہے۔ جیسے: اَبْلَغَ یُبْلِغُ اِبْلاغاً اسی طرح ثلاثی مزید فیہ سے ہی باب تفعیل(4) کے وزن پر بھی آتا ہے: بَلَّغَ یُبَلِّغُ تَبْلِیْغاً۔اِبْلاغ، تَبْلِیْغ، اَلْبلاغ، اَلْبَلَغ،ہر صورت میں اس کا معنی ایک ہی ہے یعنی پیغام کی ترسیل۔(5) البتہ لفظ تبلیغ کے معنی بہت اچھی طرح سے پہنچا دینے کے ہیں۔

ابن منظور(متوفی ۷۱۱ھ) کے نزدیک: وان کانت الروایة من البلاغ بفتح الباءِ فله وجهان: أحدهما ان البلاغ ما بلغ من القرآن والسنن، والوجه الآخر من ذوی البلاغ أی الذین بلغونا، یعنی ذوی التبلیغ(6) یعنی: "اگر لفظ بلاغ کے" با" پر زبر ہو تو اس کی دو قسمیں ہیں: ان میں سے ایک وہ چیز ہے جو قرآن وسنت کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، دوسری قسم سے مراد صاحبِ تبلیغ ہیں یعنی مبلغ وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے ہمیں تبلیغ کی، یعنی صاحبِ تبلیغ۔"

بلاغ کا معنی مقصد اور غرض و غایت کی آخر حد تک پہنچادینا ہے۔جیسا کہ راغب اصفہانی(متوفی ۵۰۲ھ) نے بیان کیا ہے: البلوغ و البلاغ الانتهاءُ الی أقصی المقصد(7)المنجد میں بھی لگ بھگ یہی معنی بیان ہوا ہے تاہم صاحبِ منجد نے اس مفہوم کو وسیع معنی میں استعمال کیا

*۔پی ایچ ڈی، جامعہ کراچی

ہے۔ان کے نزدیک ہر وہ چیز جس کو انتہا درجہ تک پہنچادیا گیا ہو، بلاغ کہتے ہیں۔(8) بلاغ کے ایک معنی کافی ہو جانا بھی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: إِنَّ فِي هَذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ (9) ''بے شک اس (قرآن) میں عبادت گزاروں کیلئے (حصولِ مقصد کی) کفایت و ضمانت ہے۔''

فصاحت پر مبنی کلام کو بھی بلاغت (بلاغ) کہتے ہیں اور بلاغتِ کلام یہ ہے کہ الفاظ کے مفردات اور پورا جملہ فصاحت کی شرائط کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ تقاضائے حال کے مطابق بھی ہو۔(10) مذکورہ کلام سے واضح ہوتا ہے کہ مکمل اور جامع ابلاغ کیلئے دو بنیادی باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

(الف) پیغام مبنی بر فصاحت ہو اور (ب) ترسیل کیا جانے والا پیغام زمانہ حال کے مطابق ہو۔

واضح رہے کہ لفظ اِبلاغ (الف بمع کسرہ) قرآن مجید میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا، تاہم بلغ، البلاغ، بلاغ، بلاغاً جیسے الفاظ ترسیلی مفہوم کیلئے وضع ہوئے ہیں۔ اعدادی ترکیب کے لحاظ سے لفظ بلغ دس مرتبہ، البلاغ گیارہ مرتبہ، بلاغ دو مرتبہ (سورہ ابراہیم ۵۲، سورہ الاحقاف: ۳۵)، بلاغاً ایک مرتبہ (سورہ جن: ۲۳) آیا ہے۔ قرآن مجید میں تبلیغ کیلئے دیگر کئی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے انذار، تبشیر، تخویف، ہدایت، ارشاد، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ۔(11)

درج بالا لغوی بحث کے تناظر میں یہ معلوم ہوا کہ ابلاغ فی نفسہ پہنچانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ البتہ مزید بحث (اسلامی نقطہ نظر سے) اس جہت پر ہونا باقی ہے کہ آیا ہر پہنچائی جانے والی بات ابلاغ کے زمرے میں آتی ہے یا صرف انہی مفاہیم کو ابلاغ کہیں گے جن سے کوئی ہدف یا مقصد ظاہر ہوتا ہے۔

اِبلاغ... اصطلاحی مفہوم

جدید ابلاغی ہیئتِ مجموعہ کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی واقعہ کو تحقیقی مراحل سے گزارنے کے بعد صوتی (آواز)، بصری (آنکھ)، تحریری (کتب و اخبار) یا علامتی (اشارہ کنایہ، مجسمے وغیرہ) شکل میں سامعین، ناظرین، قارئین اور شاہدین تک پہنچانے کا نام ابلاغ ہے۔ یہ تعریف بحث و تحقیق، تبصرہ و تجزیہ سے بالاتر ظاہراً نظر آنے والے ابلاغی ذرائع کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ تاہم بامقصد اور بامراد ابلاغ کیا ہے اور کن حالات میں اس کی وضعی ہیئت کیا ہونی چاہیے، ان نقاط کو ماہرین کی آراء میں پیش کیا جارہا ہے۔

ابوالقاسم حسن بن محمد المعروف بہ راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) لکھتے ہیں:

> والبلاغة تقال على وجهين: احدهما أن يكون بذاته بليغا و ذالك بان يجمع ثلاثة اوصاف صوابا في موضوع لغته وطبقا المعنى المقصود به وصدقا في نفسه ومتى اخترم وصف من ذالك كان ناقصا في البلاغة، والثاني: أن يكون بليغا باعتبار القائل والمقول له وهو أن يقصد القائل أمراً فيرده على وجهٍ حقيقٍ أن يقبله المقول له (12)

البلاغ کا لفظ دو طرح بولا جاتا ہے ایک یہ کہ وہ کلام بذات خود بلیغ ہو اور اس کیلئے تین اوصاف کا ہونا شرط ہے۔ (الف) وضع لغت کے اعتبار سے درست ہو، (ب) معنی مقصود کے مطابق ہو، (ج) کلام فی الواقع سچا ہو، اگر ان اوصاف میں کسی ایک وصف کی کمی ہو تو بلاغت میں نقص رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قائل اور مقول لہ یعنی متکلم اور مخاطب کے اعتبار سے بلیغ ہو یعنی کہنے والا اپنے مافی الضمیر کو خوبی سے ادا کرے کہ مخاطب کو اس کا قائل ہونا پڑے۔

شیخ محمد بن حسن طوسیؒ (متوفی ۴۶۰ھ) کے نزدیک:

> ''والبلاغ وصول المعنى الى غيره، وهوهاهنا وصول الانذار الى نفوس المكلفين'' (13)

البلاغ کسی معنی (امر) کو اپنے سے غیر تک پہنچانے کو کہتے ہیں (البتہ اسلامی نقطہ نظر سے) البلاغ کے معنی تکلیف شرعی کے حامل افراد کو (برائیوں) سے خوف دلانے کے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر القادری کے مطابق:

''ابلاغ کسی امر کو اس کے انجام تک پہنچانے کی ایسی جد و جہد کو کہتے ہیں جس میں انجام کے حصول کیلئے تمام مطلوبہ ضروریات کی اس طرح تکمیل کر دی گئی ہو کہ پھر انسان کو کسی اور ذریعے کی حاجت نہ رہے۔'' (14)

بعض دفعہ ترسیل کی جانے والی بات تحقیقی انداز کا درجہ رکھتی ہے۔ سند اور صداقت دونوں کیفیتوں کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے بعد ازاں پڑھی ہوئی، سنی ہوئی، دیکھی ہوئی بات کو انہی دو معیارات (سند و صداقت) کے تناظر میں قارئین، سامعین اور ناظرین تک پہنچایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آئندہ آنے والی تعریف میں اس طرح کا رنگ نظر آتا ہے:

''وہ قرأتی، سمعی اور بصری ذرائع جن کے ذریعہ حادثات و واقعات، مسائل اور رجحانات و میلانات کے بارے میں معلومات اکھٹی کی جاتی ہیں، ان کی سند اور صداقت کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے اور پھر ان کو اخبارات و رسائل، ریڈیو، ٹی وی یا انٹرنیٹ پر نشر کیا جاتا ہے، یہ تمام امور میڈیا (ذرائع ابلاغ) کی تعریف میں آتے ہیں۔'' (15)

دو افراد کے خیالی تعلق کو ابلاغ کہتے ہیں۔ بقول ولبر شریم:

''ابلاغ ایک ایسی کوشش کا نام ہے جس کے تحت دو یا دو سے زائد افراد ہم خیالی پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔'' (16)

مذکورہ بالا تعریف فنی اعتبار سے تشریح طلب ہے۔ اوپر بیان کی گئیں اکثر تعریفوں میں بامقصد اور بامراد گفتگو ہی کو ابلاغیات کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ ہر خیالی سوچ کو ابلاغ قرار دینا غیر ضروری طور پر مفہوم کو طول دینے کے مترادف ہوگا۔ دوسری جانب خیالی تعلق باہمی بات چیت اور گفتگو سے ہی ہوتا ہے۔ صرف خیال اور ذہنی تعلق کو ابلاغ قرار دیا جائے تو پھر یہ روحانیت کے زمرے میں چلا جائے گا۔ جبکہ ہماری پوری گفتگو کا تمام تر انحصار ظاہری ابلاغ (بات چیت) تک محدود ہے۔

لفظ صحافت بیسوی صدی کے اوائل اور وسط تک عمومی طور پر استعمال کیا جاتا رہا اور اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ چونکہ تمام ابلاغی ذرائع کا تعلق طباعت سے تھا۔ خاص طور پر برقیاتی ابلاغ کی ایجاد سے قبل صرف تحریری صنف رواج تھی، اس لئے اس شعبے کو صحافت سے ہی جانا گیا۔ یہ لفظ قرآن حکیم سے لیا گیا ہے اور جو کتابیں پیغمبر اسلام ﷺ سے پہلے نمائندگانِ خدا کی طرف سے لکھی لکھائی مل جاتی تھیں انہیں صحیفہ آسمانی کہا گیا اور قرآن حکیم نے ایک مقام پر اس کو صحفِ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کہا۔ چونے کے پتھر پر لکھائی سے لے کر کاغذ کے ایجاد تک اپنی طویل تاریخ میں صحافت کا ہمیشہ سے یہی فریضہ رہا کہ وہ خیالات و نظریات کو ظرفیت بخش کر آئندہ زمانے کی طرف منتقل کرتی رہے۔

یہ لفظ عربی سے اُردو میں داخل ہوا اور ثلاثی مجرد کے باب سے اسم مشتق ہے۔ اس کا ماخذ صحیفہ ہے جس کے معنی کتب و رسائل کے ہیں۔ صحیفہ اور صحائف عربی زبان کی ایسے اصطلاحات ہیں جو مقدس کتابوں اور صحیفوں کے قلمی نسخے تیار کرنے والوں کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔ اخبار نویسی، مضمون نگاری، رسالہ نگاری، یہ تمام کے تمام پہلو صحافتی زمرے میں آتے ہیں۔ چونکہ یہ تمام اصناف کتاب کی صورت میں متشکل ہوتی ہیں، اس لئے ان کو صحیفہ کہا گیا۔

ہمارے سامنے اس وقت ایک وسیع و عریض دنیا ہے۔ انسانی آبادی میں جس قدر اضافہ ہو رہا ہے اُسی قدر نت نئی تخلیقات و ایجادت بھی منظر عام پر آرہی ہیں۔ دنیا اپنی وسعت کے اعتبار سے انسان کے دائرہ اختیار سے باہر تھی تاہم جدید برقی آلات (ذرائع ابلاغ) نے اس وسعت کو سمیٹ کر انسان کی ہتھیلی میں رکھ دیا ہے۔ یہ انسانی زورِ محنت کا کمال رہا کہ وہ تحقیق و تدقیق کے ذریعے عجائباتِ عالم کی گہرائی و گیرائی تک پہنچ گیا اور نتیجے کے طور پر دنیا کا تسخیری عمل اس کی مٹھی میں آگیا۔

فضائی تسخیر سے لے کر سمندری عجائبات کی کھوج، سینکڑوں اور ہزاروں میل دور کسی انسان سے صاف و شفاف گفتگو اور معمول سے ہٹ کر رونما ہونے والے کسی بھی واقعہ کے بارے میں آگاہی، جدید زندگی کی قابلِ رشک ایجادات قرار پائیں۔ چونکہ یہ تمام انسانی کوششیں جستجو، تحقیق و تشکیک کے تناظر میں معرضِ وجود میں آئیں تھیں اس لئے جاننا اور مزید کھوج لگانا انسان کا وطیرہ بن گیا۔ خبر گیری، جانکاری، واقعات

کی چھان بین اور بعدازاں ان کی تشہیر، یہی وہ نکات تھے جن کی کوکھ سے صحافت نے جنم لیا۔ اب صحافت خبر بن گئی، اطلاع بن گئی، جانکاری بن گئی اور دن بھر کی معلومات کا مکمل خلاصہ بن گئی۔

رہی بات اسلام کی کہ وہ کس قسم کی صحافت کو قبول کرتا ہے یا قبول کرنے کی گنجائش رکھتا ہے۔ اوپر ذکر کئے گئے تمام مفاہیم بطور عمومی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن جب ہم اسلامی نقطۂ نظر کی بات کرتے ہیں تو یقیناً اس میں کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ کچھ شرائط کے ساتھ صحافت کے طرزِ نگارش کو بیان کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا بطور مذہب، اسلام نے چند نگارشات کو صحافت کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ من جملہ ان میں سے معتقدات و نظریات کی ترسیل اور سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی اور تہذیبی شعبہ ہائے حیات کو اسلامی اصولوں اور نظریات کے تناظر میں بیان کرنا صحافت ہے۔

جدید دنیا میں رائج نشریاتی ذرائع کو مختلف نام جیسے میڈیا (Media)، ماس میڈیا (Mass Media)، ماس کمیونیکیشن (Mass Communication) وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اُردو دان طبقہ نے ان آلاتِ نشریات کیلئے جامع اور مفصل اصطلاح ''ذرائع ابلاغ'' وضع کی ہے جو انگریزی میں رائج شدہ تمام ناموں کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ کمیونیکیشن (Communication) کا لفظ لاطینی زبان کے کمیونیس (Communis) سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے، عام (Common)، جب ہم ابلاغ کرتے ہیں تو درحقیقت ہم کسی کے ساتھ عامیت یا عام پن (Commonness) قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔(17)

ہماری گفتگو کا تمام تراحاطہ اور رسائی چار عام زبانوں (انگریزی، عربی، اُردو، فارسی) تک ہے لیکن جب ہم دنیا کی دیگر زبانوں کی طرف نظر کرتے ہیں تو ابلاغ یا اس جیسے دوسرے مفاہیم کسی نہ کسی نام سے موسوم ہیں۔ لہٰذا عمومی بات یہ ہے کہ ابلاغ اور ترسیل کا مادہ دنیا کی ہر قوم میں رائج ہے اور وہ اپنے معاشرتی تناظر میں اس جہت کا استعمال کرتی ہے۔

ابلاغِ عامہ کا نظام جو شروعاتی زندگی میں یک طرفہ ویکجہتی پہلو کا حامل تھا، دراصل اس کے ارتقائی سفر میں دنیا کی تمام اقوام کا ہاتھ ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہ نشاندہی کر سکتے ہیں کہ ابلاغ و ترسیل کی ضرورت کے پس پردہ اولین عنصر باہمی میل جول اور تعلقات تھے۔ بعد کے ادوار میں جوں جوں معاشرتی نمو ہوئی مذہب، مسلک، فرقہ اور نظریہ تخلیق ہوا اور ان میں سے ہر ایک نظریئے کی ترویج کے لئے دعوت و تبلیغ جیسی مہم بھی ایجاد ہوئی۔ ماضی بعید اور قریب میں مختلف مذاہب نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اس ابلاغی صنف سے کام لیا ہے۔ خود اسلام اپنے وجود سے لے کر اب تک دعوت و تبلیغ کا سب سے بڑا محافظ اور فائدہ اٹھانے والا مذہب رہا ہے۔

درج بالا اقتباسات، تعریفات، نظریات اور افکار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابلاغ کی لفظی ہیئت کسی بھی جہت سے ہو، اس سے ایک ہی معنی ظاہر ہوتا ہے یعنی اپنا مافی الضمیر دوسرے لوگوں تک پہنچادینا۔ البتہ بامقصد پیغام سے کیا مراد ہے یہ متعین کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ثقافت، رہن سہن، بول چال یہ دنیا کے تمام انسانوں کی بنیادیں شناخت ہوتی ہیں۔ کسی تحقیق وتدقیق کے بغیر یہ کہنا بجا اور درست ہے کہ دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی رہن سہن، بول چال اور ثقافت کی محافظ ہے۔ یہ بات بھی مسلم ہے کہ زندگی کی یہ تین مبادیات شناخت سے بڑھ کر ضرورت کے طور پر ہمیشہ سے انسان کے ساتھ رہی ہیں۔

آغاز سے لے کر اب تک انسان کیلئے ان سے مفر ممکن نہیں ہوا۔ تاہم اس دوران انسان کیلئے یہ ضرور ممکن ہوا کہ وہ اپنے خیالات و نظریات کے پھیلاؤ کیلئے کوئی ایسا ذریعہ ضرور تلاش کرے جو اس کی شناخت کی وجہ بن سکے۔ غاروں اور جنگلوں کی زندگی، رہن سہن کی ابتدائی شکل تھی۔ اشارے کنائیے، بول چال کے ابتدائی روپ تھے۔ البتہ ثقافت کی مجموعی ہیئت کافی عرصے بعد ترتیب پائی۔ غرض یہ کہ جو جس کی ذہانت تھی، صلاحیت تھی یا ہنر تھا اسی حساب سے اپنی وراثت کو نسلِ نو کی طرف منتقل کیا جاتا رہا۔ گویا اس پوری بات چیت کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ انسان نے اولین ضرورت کے تحت جس ذریعہ کو اپنی شناخت کی وجہ قرار دیا وہ باہمی میل جول اور اس کے نتیجے میں ترتیب پانے والی معاشرتی زندگی کی اجمالی صورت تھی۔

ابلاغ کو بھی متذکرہ بالا شناختی علامات کے تناظر میں بیان کرنا ہوگا کہ مقصدیت سے کیا مراد ہے؟ طریقہ زندگی، طریقہ تعلیم و تعلّم، طریقہ عبادات و معاملات ہر قوم میں الفاظ کے لحاظ سے یکساں طور پر رائج ہیں، البتہ عملی نفاذ مختلف فیہ ہے۔ مختلف مذاہب، مختلف اقوام اور مختلف مسالک کے طرز زندگی، طرزِ معاشرت اور رہن سہن کے تناظر میں متعین کی جاسکتی ہے کہ ایک قوم، ایک مذہب، ایک مسلک کی نظر میں ابلاغ کا کیا مقصد ہے؟ عبادات و معاملات کی نسل در نسل منتقلی کو ہم بامقصد ابلاغ کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں کیونکہ عبادت کا طریقہ بھلے مختلف ہو، لیکن ہر قوم کی تہذیبی و ثقافتی روایت ہے کہ پس پردہ وہ اچھائی کی حوصلہ افزائی اور برائی کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔

اسی طرح علم کی ترویج بھی تمام قوموں کی مشترکہ روایت رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر قوم نے اپنی بساط کے مطابق تبلیغی روش اپنائی، خواہ وہ ثقافت کے پھیلاؤ کی صورت میں ہو، علم کی تشہیر کی صورت میں ہو یا وراثت کی منتقلی کی صورت میں ہو۔ اس سہ جہتی طرز عمل کو ہم بامقصد ابلاغ کہتے ہیں۔ البتہ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک گائیک (گلوکار) اپنے گانوں کی تشہیر کرتا ہے، خوبصورت اور پر سوز آواز میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے تو کیا ایسے پیغامات کو ہم مثبت اور بامقصد ابلاغ کہہ سکتے ہیں؟ یا ایک فن کار اپنے فن کے ذریعے تبلیغ کرتا ہے۔

اوپر بیان کی گئی تمام بحث کی رو سے ابلاغ اور البلاغ کے مفہوم میں کوئی بھی پیغام شامل ہو سکتا ہے۔ یعنی بامقصد پیغام کی ترسیل سے قطع نظر صرف بات پہنچادینا ہی ان دونوں الفاظ کے مطمع نظر ہوتا ہے۔ البتہ لفظ تبلیغ جو کہ ایک شرعی اور اسلامی اصطلاح ہے، کے دائرے میں کسی بھی پیغام کو شامل کرنا ذرا مشکل ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لفظ تبلیغ ان مفاہیم کیلئے استعمال ہوتا ہے جو براہ راست اللہ کی طرف سے پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف ودیعت کر دیئے گئے تھے اور وہ تمام فرائض و احکام جن کی ذمہ داری آپ ﷺ کے کاندھوں پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے تمام پہلوؤں بشمول کلام عظیم قرآن مجید کی تمام آیتیں، سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات و واقعات، قدیم تاریخی واقعات کا پہنچانا اور اللہ کے پیغام کی تبلیغ کرنا، آپ ﷺ کی پوری ذمہ داری اور منصب داری تھی۔

سطور بالا میں بیان کی گئی ابلاغ کی تمام تعریفات قریب قریب اسلامی اصطلاحات کی رو سے جانی جاتی ہیں۔ ابلاغ، صحافت، دعوت و تبلیغ یہ وہ ذرائع ہیں جو بنیادی طور پر اسلام کی ہی متعارف کردہ اصطلاحیں ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی بھی اصطلاح کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اسلام کے اصولوں اور تعلیمات کے خلاف ہے۔

البتہ عام حالات میں (جدید نظریات کی رو سے) جب ہم ذرائع ابلاغ کہتے ہیں تو پھر اس میں نہ صرف دین کی تبلیغ شامل ہے، بلکہ اس میں معلومات ہیں، تفریح ہے، تحریک ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں علم بھی ہے۔ لیکن جب ہم لفظ تبلیغ کی تشریح کرنے بیٹھ جائیں تو پھر اس لفظ کے حوالے سے ایک ہی رخ نمایاں ہوگا یعنی دین اسلام کی ترسیل، چونکہ تمام انبیاء الٰہی خاص کر پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا مقصد انسانوں کو تاریکی سے نور کی طرف ہدایت کرنا تھی، اس لئے اسلام میں "تبلیغ" خدا کے پیغام کو بندوں تک پہنچانے کے عنوان سے اہمیت رکھتی ہے۔

ذرائع ابلاغ کی تقسیم:

ابلاغ کا مقصد آگاہی، معلومات کی فراہمی اور موجودہ دور میں مختلف اقوام سے رابطہ ہے۔ دوسروں لفظوں میں ابلاغ کے معنی پہنچانے کے ہیں اور یہ پہنچانے کا عمل کسی بھی صورت میں انجام پاسکتا ہے۔ زبانی کلامی صورت میں، عملی و نقلی صورت میں، اشاروں کنایوں کی صورت میں۔ گویا ابلاغ کو تاریخی نقطۂ نظر سے تین جہتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اول: قولی ابلاغ　　دوم: فعلی ابلاغ　　سوم: علامتی ابلاغ

قولی ابلاغ: ابلاغ کی یہ قسم بہت موثر اور قدیم ترین ذریعہ کے طور پر جانی جاتی ہے۔ اس کا رواج اس وقت بھی تھا جب انسان جدید تہذیب و تمدن سے آشنا بھی نہ تھا۔ ماضی بعید اور قریب میں زبانی کلامی ابلاغ زیادہ تر اجتماعات، درباروں اور مذہبی عبادت گاہوں میں وقوع پذیر ہوتا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا خطبہ حجۃ الوداع زبانی کلامی ابلاغ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ آج بھی کئی واقعات کے حوالے سے زبانی کلامی

ابلاغ کا عمل زیادہ موئثر مانا جاتا ہے۔ جیسے تبلیغی جماعت کے اجتماعات، امام حسینؓ کی مجالس، سیاسی رہنماؤں کے جلسے وغیرہ تاہم ان حقائق کے باوجود زبانی کلامی ابلاغ کیلئے الیکٹرونک آلات ہی بہترین ذرائع متصور واقع ہورہے ہیں۔ جدید انسانی زندگی میں ٹی وی چینلز، ریڈیو اور دیگر الیکٹرونک آلات زبان و بیان کے بہترین ذرائع ہیں۔

فعلی ابلاغ: اس کی بھی دو جہتیں ہیں: عملی ابلاغ، نقلی ابلاغ۔ عملی ابلاغ کا عنوان بہت موثر اور تاریخی نوعیت کا رہا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت سے قبل کی زندگی اس سلسلے میں اہم شاہد کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ چالیس سال تک آپ ﷺ کا خاموش کردار اُس زمانے کی مکی زندگی کیلئے بہترین عملی ابلاغ کا نمونہ تھا۔ "صادق و امین" کے القابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ آپ ﷺ کے خاموش ابلاغی عمل کو بہت زیادہ قریب سے جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب کے قبائل آپ ﷺ کے اس کرداری عمل سے متاثر ہو کر اپنے اجتماعی فیصلے کرواتے تھے۔ جھوٹ، دھوکہ دہی، فریب، چوری، زنا، ناپسندیدہ افعال سے اجتناب اور بری صحبت سے دوری آپ ﷺ کا وہ تبلیغی کردار تھا جس کے دور رس نتائج ہمیں آج اسلام کی حقانیت کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔ جدید دور میں عملی ابلاغ کی بہترین مثال ایک اچھے انسان کے کردار میں تلاش کی جاسکتی ہے۔

نقلی ابلاغ: اس ابلاغ کی وثاقت زیادہ موثر اور قابل بھروسہ ہوتی ہے۔ صحائفِ آسمانی، کتابیں، اور مخطوطات اس ابلاغ کے اہم ترین ذرائع ہیں۔ مسلم اُمہ کے علمی ذخائر اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ احادیث، علوم تفسیر، علم رجال، علم درایت، علم روایت نقلی ابلاغ ہیں۔ جدید دنیا میں اخبارات، رسائل، جرائد، مجلے، ویب سائٹس کو نقلی ابلاغ کہہ سکتے ہیں۔ ویب سائٹس کی ذیلی تشریحات کے ضمن میں فورم، بلاگس، سوشل نیٹ ورکنگ جیسے سماجی ابلاغیات بھی بیان کئے جاسکتے ہیں۔

علامتی ابلاغ: تصویروں اور خاکوں کے ذریعے اپنا ما فی الضمیر کا اظہار قدیم طرزِ ابلاغ ہے۔ جبکہ اشارے کنایئے بھی ماضی بعید سے علامتی ابلاغ کے طور پر انسانوں میں رائج رہے ہیں۔ خاص طور پر زبان سے معذور افراد اپنا ما فی الضمیر کے اظہار کیلئے اس طریقہ تکلّم کا سہارا لیتے ہیں۔ قبل از تاریخ اس طریقہ ابلاغ کا رواج عام تھا۔ آج بھی ایک ملک کے شہری کسی اجنبی ملک کی زبان سے نابلد ہوتے ہیں تو اسی طریقہ ابلاغ سے اپنا مقصد حل کر لیتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کا جب سفر شروع ہوا تو اس وقت انسان کی ضروریات محدود تھی۔ رسل و رسائل کی فروانی نہیں تھی۔ معاشرتی آبادی چند گنے چنے لوگوں اور قبائل پر مشتمل تھی، جو اپنی ضروریات زندگی کے حصول کیلئے ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ اس بات کی وضاحت نہیں ملتی کہ قدیم زمانے کا انسان شعوری طور پر ابلاغ کو منقسم مانتا تھا۔ تاہم یہ ضرور تھا کہ وہ باہم بات چیت کرتے تھے اور اپنے مطالب کے اظہار کیلئے اشاروں کنایوں سے کام لیتے تھے۔ تمدنی اِرتقاء کے ساتھ ہی انسان کی یہ ابتدائی زندگی محدودیت کے دائرے سے نکل گئی اور وسیع سے وسیع تر ہو کر آج ہمارے سامنے پورے آب و تاب کے ساتھ کھڑی ہے۔

اب ہر عمل کو ابلاغیات کا نام دیا گیا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے منقسم دنیا میں ابلاغیات کی نت نئی تقسیمات ایک اور سائنسی کمال ہے۔ کہاں وہ دو ہی جہات پر محیط ابلاغ کا طریقہ عمل اور کہاں یہ ابلاغ کا وسیع و عریض میدان۔ ابلاغ نے جب تحریر و تقریر (بول چال) سے نکل کر جدید ٹیکنالوجی کے دامن میں پناہ لی تو یہ کئی جہتوں میں تقسیم ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی ابلاغ کے دائرہ عمل سے خارج ہی نہیں ہے۔ اجتماع عام ہو یا خاص، باہمی بات چیت ہو یا انفرادی شخصیت کی تربیت، زندگی کے ہر پہلو میں ابلاغ کا عمل بتدریج نمایاں ہوتا جارہا ہے۔

سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی زندگی کا کوئی عمل ابلاغ سے خارج بھی ہے؟ جبکہ عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ابلاغ کا دائرہ کار کس حد تک متعین کیا جاسکتا ہے۔ مذہب (اسلام) کی قید و بند سے آزاد ہو کر سوچا جائے تو ابلاغی عمل میں کوئی حد ہی نہیں۔ ہر چیز، ہر عمل اور ہر فعل ابلاغ ہے۔ گائیکی، فن کاری، مزاحیہ نگاری، شاعری (کسی بھی صنف کی ہو) مصوّری اور دیگر حرکات و سکنات جن کا جدید انسانی زندگی سے روز مرہ کا تعلق ہے، تمام کے تمام ابلاغیات کے زمرے میں آتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے شروع میں بھی ذکر کیا تھا کہ بامقصد ابلاغ ہی اسلام کی نظر میں قابل قبول ہے وگرنہ ہر عمل یا فعل ابلاغ تو ہوگا، لیکن مقصدیت کے معنی سے خالی ہوگا۔ اسلام نے مقصدِ ابلاغ کا دائرہ کار دو پہلوپر منحصر کر دیا ہے، انسانیت کی فلاح اور معاشرے کی اصلاح، ان دونوں مساعی سے ہٹ کر کسی تیسری چیز کا وجود یقیناً نہیں ہے جو مقصدِ اسلام بھی ہو اور مقصدِ ابلاغ بھی۔

ابلاغ، آغاز وارتقاء:

زمین پر بنی نوع انسان کا پہلا قدم ایک امتحانی امر تھا۔ کتب سماوی اور دیگر ذرائع کے مطابق یہ امتحان جنت میں پیدا گئے گئے پہلے انسان جس کو زمین کیلئے ہی خلق کیا گیا تھا، سے لیا گیا۔ قرآنی مفاہیم بتاتے ہیں کہ یہ پہلے انسان حضرت آدمؑ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین کی نیابت کیلئے پیدا کیا تھا۔ ترکِ اولیٰ یا حکمِ عدولی جیسے نظریات پر بحث سے قطع نظر یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جس دن زمین پر پہلا انسانی قدم پڑا اُس دن سے ابلاغ کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ انسانی آبادی کے آغاز میں ذرائع ابلاغ کی شروعاتی ہیئت تکونی تھی:

- اللہ تعالیٰ کی ذات: جو ابلاغ کی خالق اور اس پورے عمل کا محور تھی۔
- جبرئیل امینؑ: اللہ اور پہلے انسان کے درمیان ابلاغی فرائض انجام دینے والا مقدس فرشتہ۔
- حضرت آدمؑ: پہلے انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ابتدائی ابلاغ کیلئے موزوں ظرف قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان دو ہستیوں (جبرئیل امینؑ اور آدمؑ) کو اپنے کلام کیلئے منتخب کیا۔ ایک کی ذمہ داری کلام اللہ کی ترسیل قرار پائی دوسرے نے اس امر (کلام اللہ) کو قبول کرنے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لی۔ خانہ کعبہ کی پہلی تعمیر ہو یا گندم کی بوائی، پتھر اور لوہے کی رگڑ سے آگ پیدا کرنے کے طریقے، تن ڈھانپنے کیلئے لباس اور باقاعدہ زندگی کی شروعات کے تمام امور سمیت دیگر ابلاغی تجربات فرشتوں کے ذریعے انجام پائے۔

زمین پر اُترے جانے کے بعد حضرت آدمؑ اللہ تعالیٰ سے مسلسل حالتِ ابلاغ میں رہے اور یہ تعلق فرامین کی ترسیل اور قبولیت سے بڑھ کر ادیم الارض کی پوری زندگی کو محیط کر گیا۔ مزید برآں باہمی پیغام رسانی کا یہ تعلق اُس وقت اور گہرا ہوتا گیا جب حضرت آدمؑ کو باقاعدہ زمین کی نیابت ملی۔ فرشتوں خاص کر جبرئیل امینؑ کا نزول شبانہ روز ہوا، فرامین واحکامات کی ترسیل میں تیزی آگئی یہاں تک کہ زمین پر موجود پہلے انسان اپنے خالق ازلی سے مضبوط ابلاغی تعلق پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ (18)

انسانی معاشرے کا ایک دوسرے سے باہمی رابطے کا سب سے پرانا اور سب سے موثر ذریعہ میل جول اور گفتگو ہے۔ اگر ہم معاشرے کی ارتقاء کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے بولنے، اشاروں سے اپنا مطلب وضع کرنے کے طریقوں کے بعد تحریر کا طریقہ سیکھا اور تحریر کی ایجاد کے بعد بھی انسان نے براہ راست رابطے کا سلسلہ ترک نہیں کیا بلکہ اس طریقے میں وقت کے ساتھ ساتھ نئے انداز ایجاد ہونے لگے۔ یہ ابلاغی پہلو کا ایک رُخ تھا۔ دوسرے پہلو میں جستجو، تشکیک و تحقیق وہ شروعاتی اسباب ٹھہرے جن کی بنیاد پر علم الاخبار کی ہیئتِ مجموعہ (اخبارات، رسائل، جرائد اور دورِ جدید میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا [سماجی ذرائع ابلاغ] وغیرہ) وضع ہوئی۔ اشاروں کنایوں سے آغاز کرنے والا انسان آہستہ آہستہ متمدن زندگی کی طرف بڑھا۔ خبر رسانی کی بنیاد پڑ گئی، اس کام کیلئے کبوتروں، گھوڑوں، مخبروں وغیرہ کو حسبِ موقع استعمال کیا گیا۔

باقاعدہ ابلاغی ہیئت کا تعین کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ بول چال اور اشارے کنایئے شروع سے ہی انسانی ضروریات رہے ہیں اور بالاصرار ان دو ذرائع کو ابلاغی عمل کا حصہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ قدیم زمانے کا انسان شعوری طور پر ابلاغ کو منقسم مانتا تھا، تو یہ مفروضے پر مبنی ایک دعویٰ ہی ہو سکتا ہے۔ بعض ماہرینِ ابلاغیات نے باضابطہ ابتدائی تاریخ متعین کی ہے اور قرار دیا ہے کہ آج سے دس ہزار سال قبل ابلاغِ عامہ کا عمل شروع ہوا۔ اُس دور میں ابلاغِ عامہ کی وضعی ہیئت کچھ یوں تھی:

- اشاروں اور تصاویر کے ذریعے پیغام کی ترسیل

- زبان کی توسط سے اِبلاغ
- لکھائی اور خطاطی کے ذریعے۔(19)

مشہور مورخ حافظ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) کے مطابق: ''اللہ تعالیٰ نے ارض و سماوات کی تخلیق سے پچاس ہزار قبل جملہ موجودات کی تصاویر بنادی تھیں۔ جبکہ قلم کی تخلیق بھی کائنات سے قبل کی بتائی گئی ہے۔(20) یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ سے قبل زمین پر باضابطہ ایک نظامِ حکومت کا تصور موجود تھا۔ مشہور مورخ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء) کہتے ہیں:

حضرت آدمؑ سے قبل زمین پر جنوں اور نسناس کی حکومت تھی۔ انہی جنوں کی نسل سے ایک شخص ہاموس تھا جو نہایت مقدس اور زیورِ علم و دانش سے آراستہ تھا۔اس نے پوری قوت سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا اور احکامِ خداوندی کو پوری دیانت کے ساتھ مخلوق تک پہنچایا۔(21)

بعض ماہرین کے نزدیک زمین پر انسان کا وجود کم و بیش ۱۰لاکھ سال سے ہے۔(22) بعض نظریات کے مطابق ''کائنات پہلے لگائے گئے اندازے سے بھی زیادہ قدیم ہے۔'' (23) حضرت آدمؑ کی تخلیق کے بعد انسانی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ دیگر کئی حوالوں سے ادیم الارض کی حیثیت نمایاں نظر آتی ہے وہی چند ایسی خصوصیات بھی ہیں (ابلاغی تناظر میں) جن کا تعلق صرف حضرت آدمؑ کی ذات سے ہے۔ جیسے:

''دنیا میں جتنی زبانیں آئندہ دور میں بولی جانے والی تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو سب میں ماہر قرار دیا تھا۔''(24)

''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جنت سے زمین پر اُتارا تو انہیں تمام صنعتوں کا علم بھی عطا فرمایا۔''(25)

''اولین پیغمبر حضرت آدمؑ پر ساٹھ صحیفے نازل ہوئے، بعض نے بیس اور اکیس لکھا ہے۔ جبکہ حروف تہجی بھی نازل کئے گئے تھے اور ان کی تعداد اٹھائیس تھی۔''(26)

ابن جریر طبری نے آسمانی کتابوں کی تعداد ایک سو چودہ بیان کی ہیں اور ان میں سے پچاس کتابیں (صحیفے) حضرت آدمؑ پر نازل کی گئیں۔ وہ اپنی معروف کتاب تاریخ طبری میں لکھتے ہیں:

''جملہ آسمانی کتب کی تعداد جن میں توریت، زبور، انجیل اور قرآن شامل ہیں، ایک سو چودہ تھی، جن میں سے ۵۰ حضرت آدمؑ پر ۳۰ حضرت شیثؑ اور حضرت نوحؑ پر ۲۰، حضرت ابراہیمؑ پر اور ۱۰ دیگر پیغمبروں پر نازل کی گئیں۔'' (27)

ایک جگہ طبری نے حضرت آدمؑ پر نازل ہونے والے صحیفوں کی تعداد اکیس لکھی ہے اور یہ تمام صحیفے آدمؑ نے اپنے رسم الخط میں تحریر کئے تھے۔(28)

یہ تاریخ کا وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ درجہ بالا تمام خصوصیات انسان کے تعلیم و تعلّم سے تعلق رکھتی ہیں اور قریب قریب یہ تمام خصوصیات (علم الحروف، صحیفے، تمام زبانوں کا علم) ابلاغی عمل کا آغاز بھی ہیں۔لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آدمؑ کی خلقت سے قبل بھی زمین پر آبادی تھی اور ان میں بھی ابلاغیات کا عنصر موجود تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے چار ہزار سال پہلے انسان نے تمدن کی بنیاد رکھی۔ الفبا، خط، تجارت اور دیگر تمدن کے اہم عناصر اسی دور میں معرضِ وجود میں آئے۔ پتھروں سے معماری کا کام شروع ہوا، وسائل زندگی کے آلات ایجاد کئے گئے۔ مشہور مستشرق کیرن آرم اسٹرانگ لکھتی ہیں:

''A similar spirituality had characterised the ancient world of Mesopotamia. The Tigris-Euphrates valley, in what is now Iraq, had been inhabited as early as 4000 BCE by the people known as the Sumerians who had established one of the first great cultures of the Oikumene (the civilised world). In their cities of Ur, Erech and Kish, the Sumerians devised their cuneiform script, built the extraordinary temple-towers called ziggurats and evolved an impressive law, literature and mythology'' (29)

حضرت عیسیٰؑ سے چار ہزار سال قبل میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) میں لوگ آباد تھے جنہیں سومیریوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انہوں نے مہذب دنیا کا اولین کلچر قائم کیا تھا۔ سومیریوں نے اپنے شہروں اُر، اَریک اور کش میں خط میخی ایجاد کیا، میناروں میں معبد بنائے اور ایک متاثر کن شریعت تشکیل دی۔ انہوں نے بے مثال ادب اور اساطیر بھی تخلیق کی۔

ایک اور معروف مورخ نے دعویٰ کیا ہے کہ دس ہزار سال قبلِ مسیح انسان دورِ حجری میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس انسان کی دو بڑی سرگرمیاں تھیں۔ وہ کھیتی باڑی کرنا سیکھ گیا تھا اور گھروں میں جانور پالنا بھی ان کے روزمرہ کے اُمور میں شامل تھا۔ انہوں نے اپنے آباؤاجداد کے بنائے ہوئے اوزاروں کی بجائے صیقل کئے ہوئے اوزار استعمال کئے۔ تنکوں سے ٹوکریاں بناتے جبکہ ظروف سازی بھی اُن کی صنعت بن گئی تھی۔ (30) معروف ایرانی عالمِ دین سید مجتبیٰ موسوی (متوفی ۱۴۳۴ھ) لاری کہتے ہیں:

''اسی دور میں (حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے چار ہزار سال قبل) ایک بڑا دین ظاہر ہوا۔ ابراہیمؑ نے سرزمین بابل پر خدائے یگانہ کی توحید کا پرچم بلند کیا اور خداوند عالم نے سرزمین بابل کے سرگشتہ معاشرے کی رہبری کا تاج حضرت ابراہیمؑ کے سرپر رکھا۔ آپؑ نے محنتِ شاقہ برداشت کرکے ان کے غیر منطقی عقائد و افکار سے جنگ شروع کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سربراہانِ افکارِ باطل حضرت ابراہیمؑ کے مقابلے میں صف بستہ ہوگئے۔ سب سے بڑا خطرہ ابراہیمی تبلیغ کو نمرود کی ذات سے تھا۔'' (31)

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان کا زمانہ، بقول مورخین تمدن سے خالی نظر آتا ہے، اگرچہ اس سلسلے میں کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ابراہیمؑ سے قبل کا زمانہ تاریک اور تمدن سے نابلد تھا۔ البتہ تاریخ کے لب خاموش ہیں اس لئے فرض کیا جاسکتا ہے کہ تمدنی دور کا باضابطہ آغاز بہت بعد میں ہوا۔ مورخین کا یہ نظریہ بھی قابل غور ہے کہ حضرت آدمؑ سے قبل کی تاریخ بھی آبادی سے خالی نہیں رہی ہے اور اس دور میں بھی ریاست، بادشاہان اور رعایا کی صورت میں ایک مکمل نظامِ زندگی کا وجود تھا۔ لہٰذا اگر جینے کا بہترین انداز ہی تمدن ہے تو پھر قبل از آدمؑ، مخلوقات کی زندگی کو تعبیر کرنے کا کوئی طریقہ وضع کرنا ہوگا۔

رعایا سے بھرپوران کی باضابطہ ریاست کو جو ایک سربراہ کے ماتحت ہوتی تھی، کو بالکل ہی تمدن سے مبرا قرار دینا شاید حقیقت پانے کی درست کاوش نہ ہوگی۔ یہ بات بھی نمایاں طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ ارض و سماء کی خلقت کا براہ راست تعلق مخلوقات سے ہے۔ جب آدمؑ سے قبل مخلوقات تھیں اور وہ باقاعدہ ایک نظام کے تحت زندگی گزار رہی تھی تو پھر لامحالہ وہ زندگی کے طور طریقے بھی جانتے تھے۔ وہ باہمی کلام بھی کرتے تھے اور ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے بنیادی اصلاحی طرائق بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ لہٰذا جیسے ہی دنیا میں خلقت کا آغاز ہوا ویسے ہی بول چال، رہن سہن، طور طریقے اور سب سے بڑھ کر سلیقے معرضِ وجود میں آئے اور ابلاغ کو بھی ان شروعاتی مبادیات میں سے ایک بنیادی عنصر فرض کرنا ہوگا۔

چار ہزار سال قبل مسیح کی تاریخ کو تہذیب و تمدن سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ انسان کی دنیا شناسائی سے تعلق رکھتی ہے۔ وگرنہ آبادی اور انسان کی موجودگی مندرجہ بالا تاریخ سے قبل بھی تھی۔ اس بناء پر ہم یہ کہیں گے کہ باقاعدہ تمدنی و تہذیبی دنیا کے آغاز کے بعد ایک طرف انسان نے خود کو شناخت کی منزل پر لے آیا تو دوسری طرف زمین کے طول و عرض اور عجائبات سے بھی رشتہ استوار کیا۔ یہاں چونکہ ہمارا مقصد ابلاغی عمل کو بیان کرنا ہے اس لئے ہم یہ بحث نہیں کریں گے کہ انسان کے تہذیبی شب و روز آہستہ آہستہ کیسے ترقی کی طرف بڑھے یا جدید زندگی کا فاصلہ کس قدر سرعت کے ساتھ سمیٹ گیا۔

انسان نے سیکھا، جانا اور آئندہ نسل کی طرف اپنے تجرباتی نقوش منتقل کئے۔ لامحالہ اس بات کے مشاہدے اور قرینے بڑے واضح ملتے ہیں کہ جب سے انسان کا وجود مستقر ہوا تب سے اُس نے اپنے وجود کی بقاء کیلئے سخت محنت کی۔ گروہی، اجتماعی، دفاعی، معاشی اور گھریلو زندگی، یہ وہ مدراج ہیں جو انسانی بقاء کیلئے کی جانے والی جدوجہد کے نتیجے میں تشکیل پائے۔ خوف و دہشت ہوئی تو پتھر کو صیقل کرکے ہتھیار کی شکل دی۔ اُنسیت کی ضرورت محسوس کی تو گھریلو زندگی ترتیب دی، بھوک اور پیاس کا احساس ہوا تو مختلف اَوزار تخلیق کئے، تنہائی نے کاٹ کھایا تو گروہی و

اجتماعی زندگی کی طرف راغب ہوا۔ ایک ایسے دور میں جب مختلف اشیاء پہلی دفعہ معرضِ وجود میں آئی، یہ سوچنے کی بات ہے کہ انسان علم کی باریکیوں سے ناآشنا ہونے کے باوجود کن صلاحیتوں کی بناء پر ان آلات کا موجد ٹھہرا؟ اپنے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا یہ ابتدائی فن یا سائنس تین وجوہ سے خالی نہیں:

اول: یا تو انسان عالم تھا کہ اس نے اپنے علم کے بل بوتے پر یہ آلات ایجاد کئے۔

ثانی: یا انسان میں اتنی صلاحیت تھی کہ بغیر کسی سے سیکھے، اپنی ذات میں موجد تھا۔

ثالث: یا یہ تمام اشیاء انسانی ضرورت کے تحت معرضِ وجود میں آئیں۔

اول الذکر دونوں وجوہات کو یقینی طور پر اس لئے قبول نہیں کر سکتے کہ بقول مورخین ابتدائی انسان تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھا۔ جبکہ آخر الذکر وجوہ کی اہمیت کو رد کرنا اس لئے درست نہیں کہ اس کی قبولیت کے بغیر تین وجوہ پر مبنی مفروضے کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ مفروضہ ثابت نہ ہوا تو گویا تاریخ کو بھی ہر پہلو سے رد کرنا ہوگا جبکہ ہماری پوری بات چیت کا انحصار قلم اور تاریخ پر ہے۔ لہٰذا آخری نقطہ نظر کو درست قرار دے کر ہم یہ دعویٰ کریں گے کہ انسان کا وجود چاہے تہذیب سے قبل کا ہو یا بعد کا، ہر دو صورت ضرورتوں میں گھرا رہا ہے۔ ابلاغ یعنی بات چیت، اشارے کنایئے، خاکے، نقشے اور تصویریں، یہ تمام انسان نے ضرورت کے تحت اپنائی ہیں۔ خاص طور پر بات چیت کا ابتدائی مرحلہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے جیسے ہی انسان سے متعارف کرانا چاہتا ہے۔ ذہنی ہم آہنگی نے مزید شہ دی اور مشترکہ کوششوں کے نتیجے میں انسانی رہن سہن میں بڑا انقلاب آیا۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابلاغ کی طرف راغب ابتدائی ملک، شہر یا فرد کون ہو سکتا ہے۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی تمام آبادی بیک وقت ابلاغ کی طرف متوجہ رہی ہو۔ یہ تو ماننا ہوگا کہ ابلاغ کی دریافت انفرادی کوششوں سے ہوئی ہے اس پر اجتماعیت کا حکم لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا کہ یونان، چین، جاپان اور مصر، یہ وہ قومیں تھیں جنہوں نے ابلاغی دریافت میں سبقت کی۔ تصویروں اور علامتوں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اپنی تہذیب کو مختلف ذریعوں سے برابر ترسیل کرتے رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابلاغ بھی ان ذرائع میں سے ایک بہترین ذریعہ تھا جو مذکورہ بالا قوموں کی تہذیبوں کو آئندہ نسل تک منتقل کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ بنا تو یہ بے جا نہ ہوگا۔

انسانی شعور کے فروغ وارتقاء کے ساتھ ساتھ دوسروں کے بارے میں معلومات جمع کرنے اور ان کے تجربات سے استفادہ کرنے کی خواہش بڑھتی چلی گئی، بالآخر اسی جذبے اور خواہش نے خبروں کی ترسیل کو مختلف مراحل سے گزار کر ذرائع ابلاغ کی شکل میں پیش کرنے کی ترغیب دی اور بعد میں آنے والے انسانوں نے اپنے سے ماقبل لوگوں کے حالات سے باخبر رہنے کیلئے انہی ذرائع کو استعمال کیا۔ صرف یہی نہیں کہ ان ذرائع ابلاغ سے زمانہ ماضی اور حال کے حالات معلوم کئے گئے بلکہ جہانِ عالم کے دیگر عجائبات سے واقفیت بھی انہی ذرائع سے حاصل کرنے کی رِیت پڑ گئی۔

ذرائع ابلاغ کی اہمیت

ذرائع ابلاغ کو اہمیت کیوں دیں؟ کیا زندگی کی دوسری اشیاء کوئی معنی نہیں رکھتیں؟ بالفرضِ محال اگر انسان اپنے اِرد گرد بلکہ دنیا جہاں کے حالات سے باخبر نہ ہو تو کیا قباحت ہے؟ ان تمام سوالات کے تناظر میں یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ تشکیک و تحقیق انسانی فطرت کے اصول ہیں۔ نامعلوم کو معلوم، پوشیدہ کو ظاہر اور شک کو یقین میں بدلنے کی قوت انہی دو اصولوں کی بنیاد پر انسان کو حاصل رہی ہے۔ لہٰذا حالاتِ حاضرہ و معلوماتِ عامہ کی طرف ملتفت ہونا انسان کی ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ زمین پر انسانی موجودگی کے ساتھ ہی معلومات کو جذب کرنے اور بعدازاں ان معلومات کو آئندہ نسلوں تک باقاعدہ منتقل کرنے کی وجہ ابلاغ کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر کی گئی۔

آئندہ ادوار میں اس عمل کو زمانے کی اہم ترین ضرورت سمجھ کر نسل در نسل تفویض کر دیا گیا۔ جدید عالمگیریت کے تناظر میں یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اب ذرائع ابلاغ کا مفہوم بلاغت سے بڑھ کر علمیت اور تحقیق کی سطح تک پہنچ گیا ہے۔ دنیا جہاں میں ہونے والی علمی و سائنسی تحقیقات سے آگاہی ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی سہولیات کی موجودگی میں اس بات کو مد نظر رکھ کر کہ ذرائع ابلاغ معاشرے کے بگاڑ کا سبب رہے ہیں، ذرائع ابلاغ سے منہ موڑا جائے؟ اسلام شروع سے ہی غور و فکر اور تعلیم و تعلّم کا سب سے بڑا حامی رہا ہے اور اسی نظریہ کے تحت حکمت مومن کی گمشدہ میراث قرار پائی۔ لہٰذا آج کے دور میں گمشدہ میراث کے حصول کیلئے ذرائع ابلاغ سے زیادہ بہتر راستہ کہاں مل سکتا ہے۔

عظیم فلسفی صدر الدین شیرازی عرف ملا صدرا (متوفی ۱۰۵۰ھ) جاننے اور مزید جستجو کو اللہ تعالیٰ کے پوشیدہ اسرار میں سے قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اپنے حال میں مگن اور خود ساختہ علم کے حامل انسان کی کوئی اوقات نہیں۔ ملا صدرا لکھتے ہیں:

> ”یاد رکھنا چاہیے کہ جو آدمی اپنی معلومات کی چار دیواری میں مقید ہے اور جو کچھ سمجھے ہوئے ہے اس کے سوا ہر بات کا انکار کرتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بیچارہ اپنے علم کی سرحد پر کھڑا ہوا ہے اور اپنے رب کے پوشیدہ اسرار سے محجوب اور پردے میں ہے۔“ (32)

معروف مورخ المسعودی (متوفی ۳۴۵ھ) نے تو ہر خاص و عام کو علم الاخبار کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ:

> ”دنیا کے عجائب و غرائب کا پتہ بھی علم الاخبار سے چلتا ہے جو عالم و جاہل دونوں کیلئے یکساں ہے، احمق ہوں یا عاقل دونوں اخبارِ عالم سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور عوام ہوں یا خواص، عربی ہوں یا عجمی سب کو ہر معاملے میں علم الاخبار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔“ (33)

رہبر انقلابِ ایران آیت اللہ روح اللہ الموسوی الخمینی (متوفی ۱۹۸۹ء) کہتے ہیں:

> ”نشریات (ذرائع ابلاغ) کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی محاذ جنگ پر قربان ہونے والی جانوں کی ہے۔“ (34)

عصر حاضر میں ابلاغیات کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو معروف پاکستانی عالم دین مفتی محمد شفیع یوں بیان کرتے ہیں:

- خبر گیری سنت ہے
- مسلمانوں کی قومی شکایات و مظالم کو بآسانی پہنچایا جا سکتا ہے
- اپنے حقوق کا مطالبہ بسہولت کیا جا سکتا ہے
- تبلیغی ضرورتیں بخوبی ادا کی جا سکتی ہیں (35)

ان توجہات کے تناظر میں چند باتیں ابلاغ کی ضرورت کو بہت نمایاں کرتی ہیں۔ باہمی ابلاغ سے مسلمان ایک دوسرے کے حالات و واقعات سے واقف ہوتے ہیں، ابلاغ شکایات اور مظالم کے ازالہ کا آسان راستہ ہے، حقوق منوانے کی سہل پسند راہ ہے اور اس میں تبلیغی ضروریات پورا کرنے کی خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ جبکہ اس مسابقتی دور میں ایک خود مختار ملک خاص طور پر اسلامی ریاست، جہاں وہ دفاعی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے خود کو مستحکم کرے وہی ذرائع ابلاغ سے بھی مضبوط رشتہ استوار کرے۔

ذرائع ابلاغ کا ہی کمال ہے کہ آج دنیا کے مختلف معاشروں اور ادوار میں سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور تمدنی انقلاب رونما ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی اہمیت و ضرورت ہر دور میں مسلم رہی ہے اور فی زمانہ اِن کے مناہج اور طریقے بھی نئے روپ اور نئی تبدیلیاں اپناتے رہے ہیں۔ لیکن اس پیشہ کو اس وقت تک ہی عوام میں وقار و سرخروئی حاصل رہی ہے جب تک اس کا اصل مطمع نظر رفاہِ عامہ رہا ہے۔ مفتی شفیع مزید لکھتے ہیں:

> ”اخبارات و جرائد کا وجود اپنے رنگ و روپ میں اور اپنے دنیاوی اصول کے مطابق ہو تو بہت سے عظیم الشان فوائد کا مجموعہ بلکہ قومی اور اجتماعی زندگی کا رکنِ اعظم ہے۔“ (36)

مشاہدے کی بات ہے کہ جو انسان، قوم یا ملک ترقی کی راہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہے، اس کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ ذرائع ابلاغ کو اہمیت دے۔ اس کے بغیر جدید دور میں ترقی کا تصور اور اپنی بالادستی کا خیال ایک وہم کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ مشہور اسکالر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۱۹۷۹ھ) کہتے ہیں:

> ''جو لوگ ریڈیو کے زور سے ایک سیکنڈ کے اندر باطل کی آواز کرۂ زمین کے ایک ایک کونے میں پہنچادیں اور کروڑہا انسانوں کے خیالات کو ایک جنبشِ زبان سے مسموم کرکے رکھ دیں ان کے مقابلہ میں وہ لوگ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک جلسہ کے سامعین تک بھی حق کی آواز پہنچانے میں خدا کی پیدا کی ہوئی ایک طاقت سے کام لیتے ہوئے جھجکتے ہوں۔'' (37)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے اپنے دین (ہدایت) کو انسانوں تک پہنچایا۔ جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنے زمانے اور حالات کے میسر ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچایا اور درمیان میں موجود پیغام (ہدایت) اس تکونی ہیئت کا مرکزی نقطہ قرار پایا۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ جدید دور میں ذرائع ابلاغ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے ادا کرکے رائے عامہ کی بیداری کا باعث بن سکتے ہیں۔ آج کے دور میں صرف وہی اقوام اور نظریات عالمی منظر نامے پر حاوی نظر آتے ہیں جو ذرائع ابلاغ کے میدان میں بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

حقیقت میں جدید دور ذرائع ابلاغ کے جنگ کا دور ہے۔ آج میڈیا فقط خبریں پہنچانے کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ اپنی سیاست، ثقافت یہاں تک کہ مذہب و عقائد کو دوسرے پر مسلط کرنے کے ذریعے میں بدل چکا ہے۔ موجودہ دور میں سامراج کے تسلط کا سب سے بڑا اور موثر ذریعہ بھی یہی ذرائع ابلاغ ہیں۔ آج مغربی طرزِ تکلم میں مضبوط دلیل اور حاوی رہنے کی جھلک نمایاں نظر آرہی ہے تو اس کی وجہ صرف اور صرف ذرائع ابلاغ پر بھرپور تسلط ہے۔

انہوں نے ماضی میں بھی ذرائع ابلاغ سے بھرپور استفادہ کیا اور موجودہ دور میں بھی اس کو بطور ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ اندورنی طور پر خامیاں ہی سہی لیکن بیرونِ دنیا خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف ان کے طریقہ کار میں یکسوئی نظر آتی ہے۔ اُن کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نام و نہاد جدوجہد کے پس منظر میں ان کی اکائی کام کررہی ہے اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ ان کے پیش نگاہ کسی واقعہ کی صداقت (اگرچہ وہ واقعہ خارج میں وجود بھی نہ رکھتا ہو) کیلئے ضروری ہے کہ اُس کو مسلسل اچھالا جائے یہاں تک کہ لوگ اسے سچ مان لیں۔ ہولوکاسٹ (اجتماعی بہیمانہ قتل) واقعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ فعل ثلاثی مجرد: یہ عربی گرائمر کی مبادیات میں سے ہے اور اس کا مطلب ہے کہ جس کے ماضی کے صیغہ واحد مذکر غائب میں حروف اصلی کے علاوہ کوئی اور لفظ زائد نہ ہو، جیسے نصر، ضرب وغیرہ۔ اس کے مادّے میں تین حروف ہوتے ہیں۔ چھ مختلف اوزان سے فعل ماضی بنتا ہے اور یہ اوزان فعل ثلاثی مجرد کے ابواب کہلاتے ہیں۔ ان ابواب کے نام سب سے زیادہ عام استعمال کے فعل کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ یہ ابواب مندرجہ ذیل ہیں: (۱) حَسِبَ یحْسِبُ (۲) سَمِعَ یَسْمَعُ (۳) فَتَحَ یَفْتَحُ (۴) نَصَرَ یَنْصُرُ (۵) کَرُمَ یَکْرُمُ (۶) ضَرَبَ یَضْرِبُ

2۔ باب افعال: باب افعال کے معنی جانکاری فراہم کرنا اور علم دینا ہے۔اس باب میں کسی کام کو ایک مرتبہ کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ ثلاثی مزید فیہ کے ابواب میں سے ایک ہے۔ زیادہ تر تعدیہ کیلئے استعمال ہوتا ہے۔تعدیہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے لازم کو متعدی بنایا جاتا ہے اور فاعل کو مفعول بنایا جاتا ہے۔ جیسے فعل لازم ''جَلَسَ'' کو متعدی بنائیں گے تو ''اَجْلَسَ'' ہو جائے گا۔

3۔ثلاثی مزید فیہ: فعل ثلاثی مزید فیہ سے مراد تین حرفی مادہ کا ایسا فعل ہے جس کے اصلی تین حروف کے ساتھ کسی حرف یا کچھ حروف کا اضافہ کیا گیا ہو۔ یہ اضافہ فعل ماضی کے پہلے صیغے سے معلوم ہوسکتا ہے۔اس کے آٹھ ابواب ہیں: (۱) باب افعال (۲) باب تفعیل (۳) باب مفاعلہ (۴) باب تفعّل (۵) باب تفاعل (۶) باب افتعال (۷) باب انفعال (۸) باب استفعال

4۔ باب تفعیل: باب تفعیل بھی معلومات کی فراہمی اور علم کی ترسیل کے معنی میں آتا ہے۔اس باب میں عموماً کسی کام کو درجہ بدرجہ اور تسلسل سے کرنے یا کثرت سے کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ جیسے ایک شخص نے آپ سے کسی جگہ کا پتہ پوچھا اور آپ نے اسے بتایا تو یہ '' اعلام'' ہے لیکن کسی چیز کے متعلق معلومات جب درجہ بدرجہ اور تسلسل سے دی جائے تو یہ ''تعلیم'' ہے۔

5۔اصفہانی، ابی القاسم حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، دارالمعرفۃ، بیروت، س ن، ص: ۶۰

6۔ابن منظور، لسان العرب، دار المعارف، قاہرہ، س ن، ص: ۳۴۵-۳۴۶

7۔اصفہانی، ابی القاسم حسین بن محمد، محولہ بالا، ص: ۶۱

8۔لوئیس معلوف، المنجد عربی... اُردو، (مترجم: مولانا عبدالحفیظ بلیاوی)، مکتبہ قدوسیہ لاہور، ۲۰۰۹ء، ص: ۴۷

9۔ سورۃ الانبیاء، آیت: ۱۰۶

10۔الہاشمی، سید احمد، جواہر البلاغہ، ج۱، موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، ۱۴۲۹ھ، بمطابق ۲۰۰۸ء، ص: ۲۸

11۔قرائتی، محسن، قرآن و تبلیغ، سازمان چاپ وانتشارات وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران، ص۔پ، ۱۳۱۱، ص: ۲۷ تا ۲۹

12۔اصفہانی، ابی القاسم حسین بن محمد، محولہ بالا، ص: ۶۰-۶۱

13۔طوسی، ابی جعفر محمد بن الحسن، التبیان فی تفسیر القرآن، ج ۴، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، س ن، ص: ۳۷

14۔طاہر القادری، ڈاکٹر، قرآنی فلسفہ تبلیغ، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت چہارم: ستمبر ۲۰۰۷ء، ص: ۱۱

15۔ خلیلی، منیر احمد، ''اسلامی صحافت کے لازمی تقاضے'' مشمولہ: ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور، ہندوستان، ۲۰۱۱ء، ص: ۳۱

16۔ولبر شریم، ''ابلاغ کس طرح ہوتا ہے؟''، مشمولہ: ابلاغیات، ادارہ ابلاغیات، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص: ۳۲۹

17۔ولبر شریم، محولہ بالا، ص: ۳۲۹

18۔الطبری، ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک، ج۱، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص: ۸۹ تا ۹۰

19۔امین لغاری، سعید میمن، جدید صحافت، سندھی کا اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۳

20۔ابن کثیر، ابوالفدا عمادالدین، البدایۃ والنھایۃ، ج۱، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۴۷

21۔ کراروی، نجم الحسن، تاریخِ اسلام، امامیہ کتب خانہ، لاہور، س ن، ص: ۵۱

22۔ولیم ایل لینگر، انسائیکلو پیڈیا تاریخ عام، ج۱، (مترجم: مولانا غلام رسول مہرؔ)، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۶

23۔ مشمولہ: روزنامہ جنگ (کراچی)، رپورٹ، ۲۳ مارچ ۲۰۱۳ء، ص: ۱۷

24۔ابن طاوس، سید رضی الدین علی بن موسیٰ بن جعفر، سعد السعود للنفوس، مکتب الاعلام الاسلامی بوستان کتاب قم، ۱۴۲۲ق، ص: ۱۰۰

25۔ابن کثیر، ابوالفدا عمادالدین، محولہ بالا، ص: ۱۳۳

26۔ کراروی، نجم الحسن، محولہ بالا، ص: ۱۱۱

27۔الطبری، ابی جعفر محمد بن جریر،، محولہ بالا، ص: ۳۸۸

28۔ایضاً، ج۱، ص: ۱۰۴

29۔ کیرن آرم اسٹرانگ، خدا کی تاریخ، (مترجم: یاسر جواد)، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۲

30-H.G Wells, A Short history of the World, (Cosimo Classics, New York, 2007) pg:57

31۔لاری، سید مجتبیٰ موسوی، اسلام و سیمای تمدن غرب، جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، دفتر انتشارات اسلامی، ایران، ۱۳۶۰ش، ص: ۱۱

32۔شیرازی، صدرالدین، ”اسفارِاربعہ“، حصہ اول (جلداول)، (مترجم: مولوی سید مناظراحسن گیلانی)، جامعہ عثمانیہ سرکارعالی، حیدرآباددکن ۱۹۴۱ء، ص:۱۸

33۔المسعودی، ابوالحسن بن حسین بن علی، مروج الذہب و معادن الجوہر، ج۱، المکتبۃالعصریۃ، بیروت ۱۴۲۵ھ، بمطابق ۲۰۰۵ء، ص:۴۱

34۔ خمینی، سید روح اللہ موسوی، منتخب کلمات، موسسہ تنظیم ونشرآثارِامام خمینی، س ن، ص:۱۹۹

35۔ عثمانی، مفتی محمد شفیع، صحافت اوراس کی شرعی حدود، ادارہ اسلامیات کراچی لاہور، ۲۰۰۳ء، ص:۲۹

36۔ایضاً، ص:۲۹

37۔ مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ، دعوتِ اسلامی اوراُس کے مطالبات، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۴۵۴